فوزیہ اسلم

اردو افسانے پر تقسیم برصغیر کے اثرات

مسلمانوں کو ۱۸۵۷ء میں جو نقصان پہنچا تھا۔ اس کی تلافی کہیں ۱۹۴۷ء میں آ کر اس وقت ہوئی جب مسلم قوم نے الگ وطن حاصل کر لیا۔ ایک نئی قوم وجود میں آ گئی اور ایک نیا ملک دنیا کے نقشے پر جگمگا اٹھا۔ اس میں شک نہیں کہ تہذیب و ثقافت اور زبان و ادب انسانوں کے تقسیم کرنے سے تقسیم نہیں ہوتے مگر اس میں بھی شبہ نہیں کہ ہر قوم اور ہر وطن کی اپنی ایک الگ شناخت ہوتی ہے اور اب وقت آ گیا تھا کہ پاکستانی قوم اپنی شناخت کی طرف سفر کا آغاز کر چکی تھی۔ اردو ادب کا وہ ادیب جو تقسیم سے قبل ایک مشترکہ پس منظر میں لکھ رہا تھا۔ اب اسے اپنے ملک میں بیٹھ کر اپنے حالات میں لکھنا تھا تاہم پاکستان کا قیام اپنے ہمراہ فسادات کا المیہ بھی لے کر آیا۔ ہندوستان تقسیم ہوا تو دونوں طرف نقل مکانی کا آغاز ہو گیا، قتل و غارت گری ہوئی، لوٹ مار ہوئی، عصمتوں پر حملے ہوئے۔ ایک ایسا المیہ پیدا ہوا جس نے انسان دوستی کے سارے فلسفوں کی دھجیاں اڑا دیں۔

> ''یہ محض ایک سیاسی حادثہ نہیں تھا۔ ایک عمرانی انقلاب کا پیش خیمہ تھا۔ ہمارے فنکار اس کے تماشائی نہیں تھے۔ اس طوفان سے ہو کر گزرے تھے۔ لاکھوں انسان زمین، خاندان اور صدیوں کی روایات کا دامن چھوڑ کر نقل مکانی کر رہے تھے۔ فاقے، وباء، نقل و حمل کی دشواریوں نے انسانی قدروں کی بنیادیں ہلا ڈالی تھیں۔ ایک بار انسان حیوان کی طرح خون چاٹ رہا تھا اور مخمور دیوانی آنکھوں سے عورتوں اور بچوں پر نئی افتاد توڑنے کی تدبیریں سوچ رہا تھا۔''(۱)

Scanned by CamScanner

ان تمام واقعات کا اثر انسانی زندگیوں کے ساتھ ادب پر یہ ہوا کہ موضوعات کا ایک اور دروازہ کھل گیا۔ افسانہ نگاروں نے ان فسادات میں پیش آنے والے واقعات کو تاریخ کا حصہ بنانا شروع کیا۔ کرشن چندر، بلونت سنگھ، احمد ندیم قاسمی، منٹو وغیرہ نے فسادات پر بہت چونکا دینے والے افسانے لکھے۔

احمد ندیم قاسمی کا افسانہ ''پرمیشر سنگھ'' خوف و ہراس کی اس فضا کو سامنے لاتا ہے جس میں اپنوں سے بچھڑنے کا عمل ظہور پذیر ہوتا ہے۔ اس کہانی میں ندیم نے انتہائی سنگین ماحول میں بھی انسانیت کے جذبے کو کسی نہ کسی شکل میں موجود رکھا ہے۔ جب دوسرے سکھ قتل و غارت گری میں مصروف تھے ان میں ایک ایسا بھی تھا جس نے ایک مسلمان لڑکے کی جان بچائی۔

> ''سب سکھ بے اختیار ہنس پڑے تھے سوائے ایک سکھ کے، جس کا نام پرمیشر سنگھ تھا۔ ڈھیلی ڈھالی پگڑی میں سے اس کے الجھے ہوئے کیس جھانک رہے تھے اور جوڑا تو بالکل ننگا تھا۔ وہ بولا 'ہنسو نہیں یارو' اس بچے کو بھی تو اسی واہگورو جی نے پیدا کیا ہے جس نے تمہیں اور تمہارے بچوں کو پیدا کیا۔''

کرشن چندر نے بھی کچھ اسی طرح کے خیالات پر مبنی افسانے لکھے۔ تاہم ممتاز شیریں صاحبہ نے کرشن کے ان افسانوں کی حیثیت کو ترازو کی مانند قرار دیتے ہوئے لکھا۔

> ''اس فارمولے اور ترازو کی سب سے واضح مثالیں کرشن چندر کے افسانے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کرشن چندر نے ان اصولوں کو سامنے رکھ کر یہ طے کیا ہے کہ اگر فسادات پر اتنے افسانے لکھے جائیں..... مجموعی طور پر ایسے افسانے ایسے ہوں جن میں ہندوؤں پر ظلم بیان ہو اور آدھے افسانے ایسے ہوں جن میں مسلمانوں پر ظلم کا بیان ہو۔''

Scanned by CamScanner

اس کا مطلب یہ ہے کہ فسادات کے زمانے میں دونوں طرف انسان دوستی کا حوالہ کام کر رہا تھا جو اگرچہ اس وقت کے ماحول میں گم ہو چکی تھی مگر درحقیقت اس کی خواہش ان افسانہ نگاروں کے دلوں میں موجود تھی۔

تقسیم ہند اور فسادات کے تحت ہونے والی قتل و غارت گری کے پس منظر میں جو مجنونانہ مظاہرے ہوئے۔ اس کے اثرات جس انداز سے منٹو نے قبول کیے۔ اس کی بہترین مثال ان کا افسانہ ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' ہے۔

''ایک پاگل تو پاکستان اور ہندوستان اور ہندوستان اور پاکستان کے چکر میں کچھ ایسا گرفتار ہوا کہ اور زیادہ پاگل ہوگیا۔ جھاڑو دیتے دیتے ایک دن درخت پر چڑھ گیا اور ٹہنے پر بیٹھ کر دو گھنٹے مسلسل تقریر کرتا رہا جو پاکستان اور ہندوستان کے نازک مسئلے پر تھی۔ سپاہیوں نے اسے نیچے اترنے کو کہا.....تو اس نے کہا کہ میں ہندوستان میں رہنا چاہتا ہوں نہ پاکستان میں .....میں اس درخت پر ہی رہوں گا۔''

تقسیم کے بعد جو فسادات رونما ہوئے اور ان میں جس طرح آدمی نے آدمی کو مذہب کے نام پر لوٹا۔ وہ منٹو کے نزدیک ایک تکلیف دہ حماقت تھی جس کا اظہار انہوں نے اپنے افسانے ''سہائے'' میں اس طرح کیا ہے۔

''یہ مت کہو کہ ایک لاکھ ہندو اور ایک لاکھ مسلمان مرے۔ یہ کہو دو لاکھ انسان مرے ہیں اور یہ اتنی بڑی ٹریجڈی نہیں ہے کہ دو لاکھ انسان مرے ہیں۔ ٹریجڈی اصل میں یہ ہے کہ مارنے والے کسی بھی کھاتے میں نہیں گئے۔ ایک لاکھ ہندو مار کر مسلمانوں نے یہ سمجھا ہوگا کہ ہندو مذہب مر گیا لیکن وہ زندہ ہے اور زندہ رہے گا۔ اسی طرح ایک لاکھ مسلمان قتل کر کے

Scanned by CamScanner

ہندوؤں نے بغلیں بجائی ہوں گی کہ اسلام ختم ہوگیا ہے مگر
حقیقت آپ کے سامنے ہے کہ اسلام پر ہلکی سی خراش بھی نہیں
آئی۔ وہ لوگ کتنے بیوقوف ہیں جو سمجھتے ہیں کہ بندوقوں سے
مذہب شکار کیے جاسکتے ہیں۔''

''کھول دو'' منٹو کا ایک ایسا افسانہ ہے جس میں اس کا فن عروج پر نظر آتا ہے۔ یہ دکھ کی ایسی کہانی ہے جو انسان کی انسانیت پر ایک کاری زخم کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کہانی میں مذہب کی وہ جھوٹی دیوار بھی گر جاتی ہے جس کو سہارا بنا کر آدمی درندگی کے حیا سوز مظاہرے کرتا رہا تھا۔ یہ افسانہ دراصل نقلی چہروں کے پیچھے سے اصلی چہرے دیکھنے کی کوشش ہے۔ یہ اصلی چہرے افسانے میں آٹھوں رضا کاروں کے روپ میں نظر آتے ہیں۔

'' آٹھوں رضا کار نوجوانوں نے ہر طرح سکینہ کی دل جوئی
کی۔ اسے کھانا کھلایا، دودھ پلایا اور لاری میں بٹھایا.....
ایک نے اپنا کوٹ اتار کر اسے دے دیا کیوں کہ دوپٹہ نہ ہونے
کے باعث وہ بہت الجھن محسوس کر رہی تھی اور بار بار بانہوں
سے اپنے سینے کو ڈھانکنے کی ناکام کوشش میں مصروف تھی۔''

فسادات کے ضمن میں قدرت اللہ شہاب کا ''یا خدا'' کرشن چندر کا ''ہم وحشی ہیں'' بیدی کا ''لاجونتی'' عصمت چغتائی کا ''جڑیں'' اشفاق احمد کا ''گڈریا'' حیات اللہ انصاری کا ''شکر گزار آنکھیں'' ممتاز مفتی کا ''شمنیہ'' آغا بابر کا ''کہو'' انتظار حسین کا ''بن لکھا رزمیہ'' ہاجرہ مسرور کا ''امت مرحوم'' اور ''بڑے انسان بنے بیٹھے ہو'' خدیجہ مستور کا ''دس نمبری'' اور ''مینوں لے چلے بابلا'' عزیز احمد کا ''کالی رات'' شاہکار افسانے ہیں۔

پاکستان کے ابتدائی سال ہجرت اور ہجرت کے مسائل اور فسادات کے گرد گھومتے ہیں اور قیام پاکستان کے بعد کچھ عرصہ تک افسانے کا غالب موضوع ''فسادات'' ہی رہا کیوں کہ معاشی، سماجی اور سیاسی سطح پر اس عظیم انقلاب سے متاثر ہونا ایک فطری

Scanned by CamScanner

بات تھی لیکن کچھ مدت بعد جب انتشار اور افراتفری کا دور ختم ہوا، زندگی کے بدلتے معمولات کے ساتھ ساتھ کچھ نئے موضوعات بھی افسانے میں آنے لگے ۔ اس زمانے میں ایک واضح رجحان ''ماضی پرستی'' Nostelgia کا تھا۔ نئی سرزمین پر جب لوگوں کو وہ خواب پورے ہوتے دکھائی نہ دیئے جنہیں دیکھتے ہوئے وہ اس سرزمین پر پہنچے تھے تو ان پر مایوسی کا عالم طاری ہوگیا۔ چنانچہ چند افسانہ نگاروں نے سرحد پار کے گلی کوچوں، بازاروں ، پرانے راستوں اور ان سے منسوب واقعات کو اپنے افسانوں میں بیان کرنا شروع کر دیا۔ ان افسانہ نگاروں میں انتظار حسین اور اے حمید قابل ذکر ہیں جنہوں نے ماضی کی فضاؤں اور ماحول کو اپنے افسانوں میں زندہ رکھنے کی کوششیں کی۔

انتظار حسین کا افسانہ ''اجودھیا'' آزادی کے فوراً بعد پیدا ہونے والی ذہنی کشمکش کا غماز ہے۔ نئے حالات ، نیا ماحول، آدمی کا صدیوں پرانی آباؤ اجداد کی جائے پیدائش کو چھوڑنا، سٹیشن پر لوگوں کا ہجوم، قتل و غارت گری، ظلم و بربریت کے پر ہول مناظر سے گزر کر منزل کی طرف بڑھنا اور منزل پر پہنچ کر نفسانفسی کے مناظر، اپنے گھروں کو چھوڑ کر آنے والے ماحول سے سمجھوتہ نہ کر سکنے کے سبب کشمکش سے دوچار ہیں کا کہ کہاں جائیں ،کیا کریں۔ ماضی کی یاد میں نڈھال، حال سے بے زار اور مستقبل سے مایوس آدم کی ذہنی کیفیت ''اجودھیا'' میں مجسم ہے۔

> '' یہ ایمان کیا ہوتا ہے ؟ کچھ بھی تو نہیں؟ محض ایک واہمہ ہے..... پھر ایمان کا ہجرت سے کیا ناطہ؟ بن باس ملے ہوئے ذہنوں کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ وہ تو صرف یہ سوچ رہے تھے کہ انہیں بن باس کیوں ملا؟ کس جرم کی پاداش میں ان کے اپنوں کو ذبح کیا گیا..... ان کے تنکا تنکا جمع کیے ہوئے آشیانے کو آگ کیوں لگا دی گئی ۔''

اس کے بعد افسانہ نگاری میں وہ تیزی کم ہونے لگی جو تقسیم سے قبل یا تقسیم کے

Scanned by CamScanner

بعد ابتدائی سالوں میں تھی گویا پاکستان میں افسانہ نگاری کا رجحان بہت کم ہوگیا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ افسانہ نہیں لکھا جا رہا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ افسانے کا وہ معیار دکھائی نہیں دیتا تھا جو گزشتہ برسوں میں اکثر و بیشتر ہم نے دیکھا تھا۔ یہ بحث عام تھی کہ ادب میں جمود طاری ہو چکا ہے۔ اس ضمن میں مختلف وجوہات بیان کی جاتی ہیں۔

"تقسیم کے بعد اکثر افسانہ نگاروں کے یہاں ایک خاص قسم کی تھکن اور جمود کا احساس ملتا ہے۔ اپنے گرد و پیش سے بے زاری اور آزردگی کی فضا پورے افسانوی ادب پر چھائی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔"

انتظار حسین اس ساری صورت حال کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"تقسیم کا اثر ہمارے ذہنوں پر بہت گہرا پڑا ہے۔ سماجی فضا اور سیاسی ماحول یکلخت بدل گیا۔ انگریزوں کا اثر ضرور رہا لیکن انگریز حاکم سامنے سے ہٹ گئے ......ادھر ہمیں یہ احساس دلایا گیا کہ اب قومی حکومت ہے ...... اس طرح ہم اپنے طریق کار متعین نہیں کر پائے۔ پہلے ہندو، سکھ اور مسلمان اکٹھے تھے۔ سماجی تانا بانا تھا...... استحکام تھا...... زندگی میں تسلسل تھا۔ اب یہ لوگ بٹ گئے ہیں اور ایک اور طرح کا Social Disintegration کا دور آ گیا اور نئے حالات میں لکھنے والوں کو بڑی دقت پیش آئی۔"

ہندوستان کی تقسیم سے پہلے اردو ادب ایک مشترکہ سفر تھا جو کسی ایک منزل کی طرف بڑھتا دکھائی دیتا تھا۔ مگر ہندوستان کی تقسیم کے ساتھ اب ادب کا کسی ایک ہی رخ کی طرف بڑھنا ممکن نہ رہا تھا۔ زمینی حقائق یہ تھے کہ ہندوستان اور پاکستان دو الگ الگ ملک تھے اور دونوں کو اپنی اپنی الگ شناخت کے ساتھ زندہ رہنا تھا۔ نئے مسائل کو نئے

Scanned by CamScanner

ادراک کی ضرورت تھی۔ دوسری طرف ترقی پسند تحریک اپنے امکانات کافی حد تک بدل چکی تھی پھر یہ بھی ہوا کہ ملک میں پیدا ہونے والا سیاسی انتشار و خلفشار ادیبوں کے لیے بعض مسائل بھی لے کر آیا۔ ترقی پسند تحریک پر پابندی نے اس تسلسل کو کاٹ لیا تھا جس کے تحت اب تک ادب لکھا جا رہا تھا۔ اس طرح اردو ادب کو ایک نئی فکر اور ایک نئے انداز کی ضرورت تھی جو اس کے سفر کو ایک مرتبہ پھر نئے سرے سے بھرپور بنا سکے۔

یہ واقعہ پھر کہیں ۱۹۵۸ء کے بعد پیش آیا جب پاکستان میں ادب نے انگڑائی لی اور تعطل سے باہر آیا۔ اگرچہ ۵۰ کی دہائی میں ادب لکھا جاتا رہا تھا اور کچھ نئے لکھنے والے بھی سامنے آئے تھے۔ مگر وہ اردگرد کی فضا کو متاثر نہ کر سکے تھے۔ ترقی پسند افسانہ ایک فارمولا بن گیا تھا۔ سوسوائے مکھی پر مکھی مارنے کے اس فارمولے کے تحت کوئی بڑا اور نیا امکان پیدا کر لینا کار دشوار تھا لیکن جب ۱۹۵۸ء میں مارشل لاء نافذ ہوا اور اظہار پر پابندیاں لگیں تو قدرتی طور پر ادب کو بھی ایک نئے پیرائے اظہار کی ضرورت محسوس ہوئی۔ یہی وہ زمانہ ہے جب ادب کی نئی تحریک نے سر اٹھانا شروع کیا۔ منشایاد کے مطابق:

> ''۱۹۶۰ء کے آس پاس اردو ادب میں تبدیلیوں کی ایک نئی لہر آئی اور چوں کہ فکشن کا تعلق زندگی یا زمین اور انسانی جذبوں اور رویوں سے براہ راست ہوتا ہے اس لیے اردو فکشن میں یہ تبدیلیاں زیادہ واضح نظر آئیں۔''

ادب کے نئے رجحانات بیسویں صدی کے آغاز پر ہندوستان میں داخل تو ہو گئے تھے مگر پھر سیاسی، سماجی حالات نے حقیقت پسندی اور حقیقت نگاری پر توجہ مرکوز کر دی۔ یہ جائزہ لیا جا چکا ہے کہ علامتی پیرائے کا افسانہ ایک کمزور اور موہوم سی شکل میں تقسیم سے قبل بھی موجود تھا۔ اب ایک ایسے رجحان کا ذکر ہوگا جو ۱۹۴۰ء کے گرد و پیش میں پیدا ہوا۔ مگر اس زمانے میں زیادہ پنپ نہیں سکا۔ ''ترقی پسند مصنفین کی انجمن'' کے قیام کے بعد ۱۹۴۰ء میں ''حلقہ ارباب ذوق'' کا قیام عمل میں آیا تھا۔

Scanned by CamScanner

ترقی پسند اگر ''ادب برائے زندگی'' کے قائل تھے تو حلقے کے لوگ ''ادب برائے ادب'' پر یقین رکھتے تھے ۔ اس حلقے کی تشکیل میں میرا جی نے بنیادی کردار ادا کیا تھا۔ چونکہ وہ نظم کے شاعر تھے لہذا ان کے گرد بھی نظم کے لوگ زیادہ اکٹھے ہوئے ۔ علاوہ ازیں نظم ایک ایسی جدید صنف ادب تھی ۔ جس میں نئے تجربات کی بہت گنجائش تھی۔ یہ اور بات ہے کہ اس زمانے میں ترقی پسند تحریک کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ اس لیے حلقہ محض ترقی پسندی کا ردعمل بن کر رہ گیا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد جب ترقی پسند تحریک پر پابندی عائد ہوئی تو حلقہ ارباب ذوق کو پھلنے پھولنے کا موقع مل گیا۔ دوسرے یہ کہ ۱۹۵۸ء کے بعد جب افسانہ کمزور پڑ چکا تھا اور غزل بھی ترقی پسند علامتوں کے بے دریغ استعمال کے بعد سوائے ایک آدھ نئی آواز (ناصر کاظمی) کے کچھ تھکی تھکی سی تھی نظم کو آگے بڑھنے کا موقع مل گیا۔ احمد جاوید کے مطابق:

> ''تقسیم کے بعد افسانے پر تو یہ گزری کہ وہ فسادات کے موضوع کے بعد کوئی نیا راستہ جلد تلاش نہ کر سکا تھا۔ غزل میں ترقی پسند علامتیں سست روی سے چلتی رہیں۔ مگر کہیں کہیں ہجرت کے اثرات بھی دکھائی دینے لگے ۔ جب ترقی پسند تحریک پر پابندی عائد ہوئی اور جمود کے ایک نفسیاتی وقفے کے بعد ادب نے نئے سرے سے انگڑائی لی تو نظم کے شاعر کو آگے بڑھنے میں بڑی مدد ملی۔ اس صنف شاعری میں مغربی افکار کو تیزی سے قبول کرنے کی صلاحیت تو پہلے ہی موجود تھی ۔میدان ہموار تھا، سو نظم کی تحریک آغاز ہوگئی ۔ اس میں شبہ نہیں کہ اسی عہد میں افسانہ اور غزل بھی اپنی نئی صورتوں کے ساتھ ظاہر ہوئے مگر دانشوری کا مرکز نظم ہی رہی ۔''

اس اقتباس سے یہ بات ظاہر ہے کہ ۶۰ کی دھائی کے آغاز پر تمام تر ادب میں نئے رجحانات سامنے آنے لگے تھے ۔لیکن نظم کو مرکزی حیثیت اس لیے حاصل ہوئی کہ اس

Scanned by CamScanner

نے باقاعدہ تحریک کی صورت اختیار کی ۔ آغاز ہی میں بے شمار نقاد سامنے آ گئے ۔نئی لسانی تشکیلات کا عمل شروع ہوا اور نئی نظم کے نئے منشور کا اعلان کر دیا گیا۔ ہر تحریک مخصوص حالات کی پیداوار ہوتی ہے ۔ پاکستان میں ۱۹۴۷ء کے بعد جو سیاسی و معاشرتی حالات پیدا ہوئے وہ کوئی خوش کن تجربہ نہ تھے۔ سیاست میں ابتدا ہی سے انتشار و خلفشار پیدا ہوا جو بڑھتا رہا۔ معاشی و اقتصادی حالات دگرگوں تھے۔ جب کہ نیا صنعتی و سماجی ماحول پرانی اقدار کو توڑ رہا تھا اور اجتماعی زندگی کی بجائے ''فردیت'' یعنی Individualism تشکیل پا رہی تھی ۔ بس ایسے ہی حالات میں ادب کے نئے رجحانات سامنے آئے ۔

گزشتہ ادب میں کمٹمنٹ کی بات بہت زیادہ تھی ۔ترقی پسند تحریک کے باعث نظریات پر بہت زور رہا۔ لیکن اب جو ادیب سامنے آئے انہوں نے ''نو کمٹمنٹ'' کا نعرہ لگایا اور ''عدم وابستگی'' کو اپنے ادب کی بنیاد بنایا۔ یہ لوگ پرانی اقدار سے اپنی جان چھڑانا چاہتے تھے ۔ صرف فکر کی سطح پر ہی نہیں بلکہ زبان و بیان کے معاملے میں بھی انہوں نے اپنے مخصوص رویے کا اظہار کیا۔ اسی زمانے میں افتخار جالب نے مضامین کا ایک مجموعہ ''نئی شاعری'' کے نام سے مرتب کیا جس میں ان کا اپنا مضمون ''لسانی تشکیلات'' قابل ذکر ہے ۔اس کے ابتدائی جملے ہمیں ان کے نقطہ نظر سے آگاہ کرتے ہیں ۔

> '' لسانی تشکیلات، اساسی طور پر شعر و ادب کی نیابت کرتی ہیں۔مواد کو اس ہیئت میں دیکھنا ایک رائج الوقت الحاقی معاونوں سے نجات ہی نہیں دلاتا بلکہ اس جوہر خاص کو بلا شرکت غیرے ممیّز کرتا ہے جس کی منزہ شکل و صورت کی پہچان از خود مسلک کی حیثیت رکھتی ہے ۔''

اس جملے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نئے ادب کی تحریک کو لوگ زبان و بیان کے ایک نئے پیرائے میں شامل کرنا چاہتے تھے ۔ اسی زمانے میں اس تحریک کے ایک اور نقاد انیس ناگی کا کہنا ہے۔

Scanned by CamScanner

''زبان ایک علامتی عمل ہے جس کی تشکیل اشیاء کی نام دہی کی بدولت ہوتی ہے۔ چونکہ ہر لفظ بذات خود ایک شے یا تجربہ ہے۔ اسی لیے فنکار الفاظ کی جگہ ٹا پوزیشن سے معانی کا اسلوب مرتب کرتا ہے۔ فنکار تخلیق کے لیے احساساتی علامتیں مخترع کرتا ہے اور چونکہ یہ علامتیں احساساتی ہوتی ہیں اس لیے ان کا منطقی پیرافریز نہیں کیا جاسکتا۔''

اس اقتباس سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ نئے لوگ پرانے پیرائے اظہار سے مطمئن نہیں تھے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایک ایسی نسل وجود میں آرہی تھی جو روایت سے غیر مطمئن بھی تھی اور قدرے باغیانہ ذہن بھی رکھتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آغاز ہی میں انہیں کڑی تنقید کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ اس پر تفصیلی تبصرہ کرتے ہوئے افتخار جالب نے کہا:

''نئے شاعروں نے زبان و بیان کے اسالیب بدل کر رکھ دیئے ہیں۔ ہر نیا لکھنے والا اپنے ساتھ امکانات کا ایک جہان لے کر آتا ہے۔ اس لیے چاہیے تو یہ تھا کہ طرز اظہار کے اس تغیر کو امکان کے طور پر خوش آمدید کہا جاتا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ ظہور نظر لکھتے ہیں ''جدت اور تجدید کی خواہش نے نئے لکھنے والوں کو خاصا بدحال کر رکھا ہے۔ بدحال ہونے والوں میں زیادہ تعداد جدید شعراء کی ہے۔ شاید اس لیے کہ یہ صنف ادب جسے شاعری کہا جاتا ہے اپنے اندر مبہم اور مہمل الفاظ و خیالات کو سمونے کی بے پناہ قوت رکھتی ہے۔ خاص طور پر نظم جدید افسانہ یا دوسری اصناف ادب کی سی پابندیاں تو نظم پر کبھی بھی عائد نہیں ہوئیں۔ پھر بھی کسی نئے زمانے میں کچھ ایسی ضرورتیں ضرور موجود تھیں۔ جنہیں پورا کیے بغیر نظم، نظم نہیں کہلاسکتی تھی۔ جدید سے جدید تر کی خواہش نے آہستہ آہستہ یہ ضرورتیں غیر ضروری قرار دے دیں۔

Scanned by CamScanner

ردیف، قافیہ، تغزل، بحر کی ضرورت اب کسے محسوس ہوتی ہے؟ البتہ واجبی سا ردھم اور بے نام سا مجموعی تاثر اب بھی چلتا ہے۔ وہ بھی نیم جدید یا نیم قدامت پسند حلقوں میں۔ جدید تر شعراء تو اسے بھی آثارِ قدیمہ تصور کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جدید نظم کے لیے بنیادی چیز فنکار کا عنائی تفکر ہے۔ جسے ذہنی اپج، قلبی عمق اور تجریدی تکنیک کے ساتھ پیش کرنے کے بعد ردھم کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی۔ مجموعی تاثر کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ خود بخود پیدا ہو جائے تو چل سکتا ہے ورنہ نیا ذہن خواہ وہ لکھنے والے کا ہو یا پڑھنے والے کا ایسی تخلیقات سے بور ہو جاتا ہے جن میں مجموعی تاثر پیدا کرنے کی شعوری کوشش کی جاتی ہے۔ چنانچہ جدید تر حلقوں میں وہ نظمیں زیادہ جدید اور زیادہ مکمل سمجھی جاتی ہیں جو یا تو سرے سے کوئی تاثر ہی نہیں چھوڑتیں یا راکٹ کی سی تیزی کے ساتھ بیک وقت کئی تاثر چھوڑ کر اڑ جاتی ہیں۔ اس استدلال میں مزید رنگ و روغن پیدا کرنے کے لیے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ان شاعروں کا رشتہ اس زمین سے نہیں۔ ان کے پاس کوئی احساس ماضی نہیں۔ یہ گریز پا زمانہ حال کے قیدی ہیں اور تہذیب و ثقافت سے بے بہرہ ہونے کے باعث انقطاع اور جلاوطنی کا شکار ہیں۔''

مذکورہ بالا طویل اقتباس اس اعتبار سے ہماری بڑی مدد کرتا ہے کہ اس میں نئی شاعری کے علم برداروں کے خیالات بھی موجود ہیں اور اس کے ردعمل میں ظاہر کیے جانے والے خیالات و احساسات بھی صاف دیکھے جاسکتے ہیں۔ نئے شاعر بغاوت پر آمادہ ہیں۔ ماضی سے کوئی رشتہ نہیں رکھنا چاہتے۔ زبان، تہذیب و ثقافت، ادب اور زندگی سب کے بارے میں ان کا ایک الگ ہی نقطہ نظر ہے۔ خیال رہے کہ نظم پر اس قدر طویل گفتگو اس

Scanned by CamScanner

لیے کی گئی ہے کہ یہی صنف اس وقت سب سے زیادہ مقبول ہوئی اور تحریک بنی۔ حالاں کہ جدید افسانہ بھی وجود میں آچکا تھا۔ خود اس مضمون میں شاعروں کے ساتھ ساتھ بعض جدید افسانہ نگاروں پر بھی تبصرہ کیا گیا ہے۔

"یہ مسئلہ محض شاعری تک ہی محدود نہیں۔ جدید افسانہ نگار انور سجاد، خالدہ اصغر، بلراج مینرا، سلطان غازی جس فرد کا رزمیہ لکھنے کی کوشش کر رہے ہیں وہ تنہا و درماندہ ہے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ آج کل کی اصناف سخن تنہائی، اداسی، اکیلے پن اور ویرانی کے اظہار میں جتی ہوئی ہیں۔"

نئے ادب کی تحریک سے یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ اب ایسا زمانہ آ گیا کہ جب رجائی نقطہ نظر کے بجائے نفی، تشکیک، یاسیت اور الم پرستی کا رجحان پیدا ہوا جو زبان و بیان میں نئی لفظیات اور علامتوں کا متلاشی و متقاضی تھا۔ اصل میں یہ وہ زمانہ ہے۔ جب برصغیر میں صنعتی زندگی کے اثرات بڑھنے لگے تھے۔ نئی شہری تہذیب کچھ نئے نفسیاتی مسائل لے کر آئی تھی۔ طبقات کی تقسیم واضح ہوگئی تھی اور اجتماعی زندگی کے بجائے انفرادی زندگی کی طرف رجحان بڑھ گیا تھا۔ یورپ پہلے ہی اس تجربے سے گزر چکا تھا۔ اب اسی تجربے کا سامنا ہمارے معاشرے کو تھا۔ مادیت پرستی نے انسان کو ہوس زر میں مبتلا کیا۔ جھوٹ، فریب، رشوت، بدکاری، حصول زر کے کار آمد حربے بن گئے۔ اس پر مستزاد سیاسی ریشہ دوانیاں، مارشل لائی آمریت، نفسا نفسی، ہجوم کا شور وغوغا اور زندگی کے بے معنویت نے فنکار کو اپنے اندر تنہا کرنا شروع کیا۔ نتیجتاً نیا ادیب اسی تنہائی، مغائرت، اکیلے پن اور اداسی کی طرف راغب ہوگیا اور اس کا اظہار کرنے لگا۔ چونکہ زبان و بیان کے نئے تجربوں کا بھی آغاز ہو گیا تھا۔ اس لیے اس عہد میں ایک مسئلہ ابلاغ کا بھی کھڑا ہوا۔ نئی لفظیات اور نئی علامتیں پرانے طریقہ اظہار سے بالکل مختلف تھیں۔ جب ابہام پیدا ہوا تو نئے نقاد نے یہ کہا کہ ادیب اپنے لیے لکھتا ہے قاری کے لیے نہیں یہ قاری

Scanned by CamScanner

کا اپنا مسئلہ ہے کہ وہ اپنی ذہنی سطح کو تخلیقی فن پارے کی سطح تک بلند کرے۔ اگر وہ ایسا نہیں کر سکتا تو اس کی ذمہ داری ادیب کے سر نہیں۔

"ابہام شاعر سے زیادہ قاری کا مسئلہ ہوتا ہے۔ جب قاری شعری تخلیق میں معانی کی سطح کو متعین کرنے میں کامیاب نہیں ہوتا تو ابہام کا مسئلہ جنم لیتا ہے۔"

اس ساری بحث سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ۶۰ کی دہائی میں ہمارے سامنے جو ادبی گروہ آیا وہ خارجی جبریت کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ لہذا اس نے زبان و بیان اقدار اور پرانے ادبی فارمولوں کو ہی مسترد نہیں کیا بلکہ قاری کو بھی غیر اہم قرار دے دیا۔ اسی زمانے میں ہمارے ہاں ادب کے وہ تمام نظریے و فلسفے مقبول ہوئے جنہوں نے یورپ میں جنم لیا تھا اور بہت جلدی مقبول ہو گئے تھے۔ یہ نظریات تقسیم سے پہلے ہی ہمارے ہاں پہنچنے لگے تھے جن کا سراغ محمد حسن عسکری کی اس زمانے کی تنقیدی تحریروں میں مل جاتا ہے لیکن ان کی مقبولیت کا زمانہ اب آیا۔

"۱۹۶۰ء کے عشرے میں ..... عالمی ادب میں بھی نئی نئی تحریکوں نے جنم لیا۔ مغربی افسانوں پر سارتر کے فلسفہ وجودیت اور کافکا اور جیمس جوائس کے آزاد تلازماتی انداز کا بہت اثر تھا۔ اردو افسانے نے بھی ان تحریکوں کا اثر قبول کیا۔"

نئے ادب کو جس فکر نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ "وجودیت" کا فلسفہ یعنی "Existentialism" تھا۔ اگرچہ "وجودیت" پر بحث مقصود نہیں لیکن چونکہ اس فلسفے نے جدید ادب اور بالخصوص جدید افسانے پر اپنا کافی اثر چھوڑا۔ اس لیے اس کے بارے میں تھوڑی سی آگاہی حاصل کرنا ضروری ہے۔ یہاں کرکیگارڈ کا ایک بیان توجہ طلب ہے۔

"جب ایک شخص زمین پر اپنی انگلی رکھتا ہے تو وہ اس کی بو سے یہ معلوم کر لیتا ہے کہ وہ کس قسم کی زمین پر کھڑا ہے۔ میں اپنی

Scanned by CamScanner

انگلی اپنے وجود پر رکھتا ہوں مگر اس سے کسی قسم کی بو نہیں آتی۔
میں کہاں ہوں؟ میں کون ہوں؟ میں یہاں کیسے آیا؟ یہ چیز
کیا ہے جسے دنیا کہا جاتا ہے؟ مجھے یہاں کون لایا تھا؟ اور اب
وہ میری نظروں سے اوجھل کیوں ہے؟ میں اس دنیا میں کیوں
کر آیا؟ آخر مجھ سے مشورہ کیوں نہیں لیا گیا؟''

وجودیت کا مسئلہ بنیادی طور پر وجود کے بارے میں سوال اٹھاتا ہے اور بہت ساری الجھنوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ انسان کا ہونا ہی ایک سوال ہے۔ ڈیکارٹ نے کہا تھا کہ میں سوچتا ہوں اس لیے موجود ہوں'' لیکن میں کون ہوں؟ اس کا جواب تو ڈیکارٹ کے پاس بھی موجود نہیں تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وجود کا سوال اٹھتے ہی عقل کی برتری ختم ہو گئی۔ اس لیے اس کے پاس بہت سے سوالوں کا جواب نہ تھا۔ یہیں سے زندگی ایک بے معنی عمل ہو جاتی ہے۔

''انسانی وجود کی اس درماندگی نے فکر کی پناہیں تراشیں ہیں اور فلسفہ وجودیت کو جنم دیا ہے۔ کرکیگارڈ اور سارتر کے یہاں بعض اہم اختلافات کے باوجود زندگی کی رائیگانی کا تصور موجود ہے اور خود صفحہ زمین پر انسان کا ظہور بے معنی و مضحک ٹھہرتا ہے۔ حیات کی معنویت کے تصور سے عاری اس فکر نے ادب میں بھی لایعنیت کے رجحانات کو فروغ دیا ہے۔''

یہ بات طے ہو جانے کے بعد کہ فلسفہ وجودیت، عقلیت پرستی کے رجحان کا ردعمل ہے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اسی سے زندگی کو بے معنی اور لایعنی عمل سمجھنے کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ اس فلسفے نے مختلف فلاسفروں کے ہاں مختلف صورتیں اختیار کی ہیں۔ سارتر نے اسی آزادی کا مفہوم اخذ کیا ہے۔ وہ انسان کے بارے میں کہتا ہے کہ:

"Man is condemned to be free."

Scanned by CamScanner

"آدمی کی سب سے بڑی سزا یہ ہے کہ آدمی کو آزاد ہونا پڑے گا۔"

اس نقطہ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے ممتاز احمد کہتے ہیں:

"آزادی کے اسی تصور نے انسان کو ذمہ داری کا احساس دلایا اور اس ذمہ داری نے اس میں بے چارگی، خوف، دہشت اور ہراس پیدا کیا۔ سارتر کا کہنا ہے کہ اگر آدمی وہی کچھ ہے جیسا کچھ کہ وہ اپنے آپ کو بناتا ہے اور اپنے آپ کو بناتے وقت وہ پوری بنی نوع انسان کی ذمہ داری اپنے سر لیتا ہے۔ اگر کوئی مستقل قدر اور کوئی اخلاقی ضابطہ موجود نہیں ہے اور ہمیں ہر بات میں اگلے ہی فیصلہ کرنا ہوتا ہے بغیر کسی بنیاد، بغیر کسی رہنمائی کے تو آخر ہم فیصلہ کرنے سے پہلے پریشانی سے کیسے بچ سکتے ہیں۔ جب ہمارا ہر فعل کائنات کے مفہوم اور کائنات میں انسان کے مقام کا تعین کرتا ہو تو پھر یہ کیسے فرض کر لیا جائے کہ ہم اس ذمہ داری کے سامنے اپنے آپ کو سہا سہا اور خوفزدہ نہ پائیں گے۔"

اس سے یہ فلسفہ پیدا ہوا کہ اہمیت صرف فرد ہی کو دینی چاہیے کیوں کہ وجود ہی واحد حقیقت ہے۔ سارتر کی مقبولیت کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ اس نے فرد کی آزادی اور خود مختاری ہی کی بات نہیں کی بلکہ فرانسیسی نو آبادیوں کی خود مختاری کی آواز بھی بلند کی۔ سارتر کا یہ رویہ تیسری دنیا میں فلسفیانہ حوالے کے علاوہ کسی قدر سیاسی حوالے سے بھی مقبول ہوا بلکہ ترقی پسند حلقوں میں "ترقی پسندی" کی جو اصطلاح آئی اس میں بھی اس فلسفے کا عمل دخل تھا۔ حالانکہ خود سوشلسٹ (Socialist) اس فلسفے پر کڑی تنقید کرتے تھے۔

"آزادی و خود مختاری کا جو تصور وجودیت میں ہے وہ غیر سماجی ہے اور جبریت سے ہزار گنا بدتر۔ فلسفہ وجودیت کی خود مختاری سے ہم کنار ہو کر ایک فرد جن کیفیات کا شکار ہوتا ہے وہ خود وجودیوں کے نزدیک غصہ، جھنجھلاہٹ، دستبرداری، یاس اور کرب کی کیفیات ہیں۔"

Scanned by CamScanner

فلسفہ وجودیت کے علاوہ نئے ادب پر کہیں کہیں تصوف کے اثرات بھی پڑے اور اس کا سبب نئے ادیب کے رویے میں چھپی ہوئی بے پروائی اور خود ترحمی بھی ہو سکتے تھے لیکن ایک وجہ اس دنیا میں انسان کی بے حوصلگی بھی تھی۔

''۱۹۶۰ء کی دہائی کے بعد زندگی اور اس کے مسائل کے بارے میں ایک دم نقطہ نظر بدل گیا اور عقائد کی شکست و ریخت کے نتیجے میں ادیب زندگی کی بے سمتی کا شکار ہو گئے۔ ان کے سامنے کوئی مخصوص نظریہ حیات یا نقطہ نظر نہیں رہا۔ لہذا کوئی تصوف کی جانب دیکھ رہا ہے تو کوئی وجودیت کی جانب.....''

یہ تمام تفصیل تمہید میں اس لیے آئی تا کہ یہ معلوم کیا جا سکے کہ ہمارے ہاں نئے ادب کی بنیادیں کیا تھیں اور کون سے فلسفے و افکار ایسے تھے جو نئے رجحانات و رویوں کو بنیادیں فراہم کر رہے تھے۔ نظم کی تحریک نے پورے ادبی ماحول کو بدل دیا جس سے نئے افسانے کو بھی آگے بڑھنے اور اپنی راہیں متعین کرنے کا موقع حاصل ہو گیا۔

''۱۹۶۰ء کے لگ بھگ نئی لسانی تشکیلات کی بحث چل نکلی۔ بنیادی طور پر یہ شاعری کی تحریک تھی لیکن افسانے پر بھی اس کے اثرات پڑے اور افسانے میں بھی علامتی اور تجریدی رجحانات کا فروغ ہوا۔''

ترقی پسند افسانے کا عہد فسادات کے ادب سے زیادہ آگے نہیں بڑھ سکا تھا۔ ترقی پسند تحریک پر پابندی نے پرانی تکنیک اور طریقہ کار کے عروج کا قریب قریب خاتمہ کر دیا۔ جب نئی نظم کی تحریک شروع ہوئی تو افسانے کے بھی نئے امکانات سامنے آ گئے۔ آغاز میں انتظار حسین، انور سجاد، خالدہ اصغر (خالدہ حسین) اور بھارت میں سریندر پرکاش، بلراج مین را نے علامتی و تجریدی افسانہ لکھنے کا آغاز کیا۔ یہ نیا افسانہ بھی قاری کے لیے بہت سی مشکلات لے کر آیا۔ موضوع، اسلوب، علامات سب نئے اور انوکھے تھے۔

Scanned by CamScanner

اس نئے طرز کے افسانے میں کہانی کا عنصر اس طرح بھرپور نہیں تھا جس طرح روایتی افسانوں میں دکھائی دیتا تھا۔ پھر ابلاغ کے مسئلے نے Communication Gap پیدا کیا تو نیا افسانہ ایک متنازع صنف بن گیا۔

"جدید افسانے نے قارئین کے لیے بہت سے مسائل بھی پیدا کر دیئے۔ ان میں ایک مسئلہ افسانے میں کہانی کے عنصر کا فقدان اور دوسرا مسئلہ ابلاغ کا خلا (کمیونیکیشن گیپ) ہے ..... یہ جدید افسانے کا سب سے بڑا مسئلہ ہے اور جدید افسانے کی تفہیم میں سب سے بڑی رکاوٹ بھی۔"

انتظار حسین اور انور سجاد ابتدا میں روایتی کہانیاں لکھتے رہے تھے۔ لیکن ۱۹۵۸ء کے بعد وہ ایک نئے روپ میں سامنے آئے۔ انتظار حسین نے شروع ہی سے داستانی اسلوب کو اختیار کیا اور اس کی مدد سے بدلتی ہوئی معاشی صورت حال، اقدار کی شکست و ریخت اور مرتے ہوئے ماضی کا المیہ بیان کیا۔ ان کا پہلا افسانہ "آخری آدمی" ہے۔ انور سجاد نے تجریدی پیرایہ اختیار کیا۔ ان کی ابتدائی کہانیوں پر فلسفہ وجودیت کے اثرات دکھائی دیتے ہیں۔ کچھ ایسا ہی اثر بلراج مینرا پر بھی دکھائی دیتا ہے۔ سریندر پرکاش نے ہندی اساطیر کی مدد حاصل کی۔ خالدہ حسین کے ہاں ذات کی تنہائی کا موضوع ابھر کر سامنے آیا۔ تاہم یہ بات طے ہے کہ یہ عہد نظم ہی کا تھا۔ افسانہ آگے چل کر پھر اپنی شکل بناتا ہے۔ اس عہد کے افسانے کی زبان پر نظم کے اثرات بھی پڑے۔ اس طرح نثر میں شعریت کا عنصر بھی داخل ہوا۔ اس عہد کا افسانہ اپنے گرد و پیش کو اسی طرح دیکھتا ہے جس طرح ادب کی دیگر اصناف دیکھ رہی تھیں۔ وہی ذات کی تنہائی، بے حاصلی، بے چارگی، مغائرت، تنہائی، جھنجھلاہٹ، تلخی یہی وہ عناصر ہیں جو افسانے کا مزاج بناتے ہیں اور ایک ایسی زبان وضع ہوتی ہے جو رمز و علائم سے بھرپور ہے۔

"قومی و بین الاقوامی حالات کے نتیجے میں باہر سے نئے علوم کی آمد،

Scanned by CamScanner

بعض سیاسی ادبی تحریکات، زندگی کے بارے میں نئے فلسفیانہ زاویہ نظر، خصوصاً جدیدیت، وجودیت کی تحریکوں کے زیر اثر عدم تحفظ، تنہائی، بے بسی، بے یقینی، ذات کی گمشدگی اور بھری دنیا میں بے یار و مددگار ہونے کا خوف و ہراس اور ادراک و احساس پہلے کے مقابلے میں زیادہ ہو گیا ہے۔ اس شدت احساس نے موضوعات کے ساتھ موضوعات کے برتنے کے ڈھب کو بھی خاصا بدل دیا۔"

نیا ادب اور نیا افسانہ ادبی سطح پر بہت سے مباحث لے کر آیا تھا۔ یہ اعتراضات زبان و بیان کے بھی تھے اور رویے کے بھی۔ نظم تو مقبول ہو چکی تھی۔ افسانہ دیر تک چند ناموں کے گرد گھومتا رہا۔ نظم نے خارجیت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا اور اس کے خلاف مدافعت کا یہ طریقہ نکالا تھا کہ ایک ایسی زبان وضع کرنے کی کوشش کی تھی کہ جو ادیب کا ادیب سے رشتہ تو قائم کرتی تھی مگر قاری تک اس کی رسائی کار دشوار تھی۔ لیکن جوں جوں ہمارا سیاسی ماحول بدلتا گیا اور زمینی حقائق فرد کو اجتماع بننے پر مجبور کرنے لگے تو "نئی لسانی تشکیلات" کی مقبولیت میں کمی آنے لگی۔ یہی وہ عہد ہے جب نظم کی تحریک کمزور پڑ گئی اور افسانہ کا دائرہ وسیع ہونے کا عمل شروع ہونے لگا۔ اس دہائی کے اختتام تک افسانے کے میدان میں بہت سے نئے لوگ داخل ہوئے جن میں رشید امجد، اعجاز راہی، منشا یاد، مظہر الاسلام، سمیع آہوجہ، احمد داؤد اور احمد جاوید وغیرہ شامل ہیں۔ یہ تمام افسانہ نگار ۶۰ کی دہائی میں ابھر کر سامنے آئے اور انہوں نے اپنی شناخت بنائی۔

Scanned by CamScanner

حوالہ جات

محمد حسن، ڈاکٹر۔ ''روح تنقیدی ادب''، عشرت پبلشنگ ہاؤس، لاہور، ص ۶

احمد ندیم قاسمی'' بازار حیات''۔ اساطیر، لاہور۔ طبع اوّل، ۱۹۹۵ء۔ ص ۸، ۷

ممتاز شیریں ''معیار'' نیا ادارہ، لاہور۔ ۱۹۶۳ء۔ ص ۲۰۵

اطہر پرویز (مرتب) ''منٹو کے بہترین افسانے''۔ مکتبہ شعر و ادب، لاہور۔ ص ۸

سعادت حسن منٹو'' خالی ڈبے خالی بوتلیں''۔ مکتبہ شعر و ادب، لاہور۔ ۱۹۵۰ء۔ ص ۲۳

سعادت حسن منٹو'' منٹو راما'' سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور۔ طبع اول ۱۹۹۵ء، ص ۲۵

انتظار حسین ''قصہ کہانیاں'' (پہلی جلد) سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور۔ طبع اول ۱۹۹۰ء، ص ۲۶

محمد عالم خان'' چند نئے ادبی مسائل''۔ پاکستان بکس اینڈ لٹریری ساؤنڈز، لاہور۔ طبع اول، ۱۹۹۱ء، ص ۱۶

انتظار حسین ''نقوش'' (جلد دوم) افسانہ نمبر ۱۹۵۵ء۔ شمارہ ۵۴۔ ص ۱۰۵۳

منشاد یاد'' فکشن ۱۹۹۵ء'' مشمولہ روزنامہ جنگ، راولپنڈی، سوموار ۲۲ جنوری ۱۹۹۶ء، ص ج

''عبارت'' (مرتبہ) نوازش علی، ڈاکٹر۔ دھنک پرنٹرز، راولپنڈی۔ طبع اول ۱۹۹۷ء۔ ص ۳۳

افتخار جالب (مرتب) ''نئی شاعری''

انیس ناگی'' نئی شاعری کا لسانی پرائیہ'' مشمولہ ادب لطیف، لاہور۔ سالنامہ ۱۹۶۸ء۔ ص ۶۸

افتخار جالب ''نئی شاعری سامراج کی سازش ہے'' مشمولہ ادب لطیف، لاہور۔ سالنامہ ۱۹۶۸ء۔ ص ۵۵، ۵۴، ۵۳

افتخار جالب ''نئی شاعری سامراج کی سازش ہے''۔ ص ۵۹

انیس ناگی'' نئی شاعری کا لسانی پیرائیہ'' ص ۵۲

غفور شاہ قاسم'' پاکستانی ادب'' بک ٹاک، لاہور۔ طبع اوّل، ۱۹۹۵ء۔ ص ۸۵

ممتاز احمد'' وجودیت۔ منظر و پس منظر''۔ مشمولہ فنون، لاہور۔ جولائی اگست ۱۹۶۶ء۔ ص ۸۸

Scanned by CamScanner

۱۹۔ حنیف فوق، ڈاکٹر، متوازی نقوش، نفیس اکیڈمی، کراچی، طبع اول ۱۹۸۹ء، ص ۳۸
۲۰۔ فردوس انور قاضی'' اردو افسانہ نگاری کے رجحانات''، مکتبہ عالیہ، لاہور، طبع اول، ۱۹۹۰ء، ص ۲۸۰
۲۱۔ ممتاز احمد ''وجودیت۔ منظر و پس منظر''۔ ص ۹۱
۲۲۔ ممتاز احمد ''وجودیت'' منظر و پس منظر''۔ ص ۹۴، ۹۳
۲۳۔ شہزاد منظر ''علامتی افسانے کے ابلاغ کا مسئلہ'' منظر پبلی کیشنز، کراچی ۱۹۹۰ء۔ ص ۸۶
۲۴۔ رشید امجد ڈاکٹر۔ '' شاعری کی سیاسی و فکری روایت'' دستاویز مطبوعات، لاہور۔ طبع اول، ۱۹۹۳ء۔ ص ۴۱
۲۵۔ شہزاد منظر ''جدید اردو افسانہ'' منظر پبلی کیشنز۔ طبع اول ۱۹۸۲ء۔ ص ۱۳
۲۶۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر'' اردو افسانہ اور افسانہ نگار''۔ اردو اکیڈمی سندھ، کراچی۔ ۱۹۸۲ء۔ ص ۶۲

Scanned by CamScanner